اسلامی تحریکیں: ماضی اور حال

معیشت و سیاست کے محاذ پر

خلیل احمد حامدی

اسلامی تحریکوں کے ضمنی اثرات

قافلہ گزر رہا ہو تو ارد گرد کی فضا بھی متاثر ہو جاتی ہے۔ جرسِ کارواں کی آوازدور دور تک پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح شرکائے قافلہ تو جانبِ منزل رواں دواں رہتے ہی ہیں' مگر جو شریکِ سفر نہ بھی ہوں وہ بھی قافلے کی جذبہ انگیز حرکت' پرسوز حدی اور پرعزم چہروں سے اپنے اندر ایک ولولہ و جوش محسوس کرتے ہیں۔ یوں فضائے قافلہ بھی قافلہ ہی کا ایک حصہ بنتی جاتی ہے۔ تحریکاتِ اسلامی کا قافلہ نصف صدی سے زائد عرصے سے پابہ سفر ہے۔ اس نے مسلمانوں کے اندر نئے سرے سے اسلام کی جوت جگائی ہے۔ اسلام کا اصل تصور اور اصل اصطلاحات اور ادارے جو دورِ استعمار میں مسلمانوں کی ڈکشنریوں سے محو ہو چکے تھے' زندہ کیے ہیں۔

اسلامی خلافت' اقامتِ دین' جہاد' اسلامی تہذیب و تمدن' قوانینِ شریعت' اسلامی اقتصادیات' اسلامی تعلیم' اجتہاد' وحدتِ امت' یہ وہ اصطلاحات ہیں جو مسلمانوں کے ذہن سے نکل چکی تھیں اور ان کے بجائے مغرب کی رائج کردہ اصطلاحات اور ادارے ذہنوں میں راسخ ہو چکے تھے۔ اسلامی تحریکوں نے ان مدفون اصطلاحات کو مسلمانوں کے لٹریچر اور مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ میں ازسرِنو نقش کیا۔ چنانچہ وہی لوگ جو اسلامی نظامِ زندگی سے آشنا نہ تھے' اسلام کو قصۂ ماضی سمجھتے تھے' مذہب اور سیاست کی تفریق پر ایمان لا چکے تھے' بلکہ اسلامی اصطلاحات کا کبھی تذکرہ ان کے سامنے ہو جاتا تو وہ شرما جاتے تھے اور مغربی تہذیب اور مغرب کے نظریات کو حتمی اور حرفِ آخر قرار دے کر ان پر کامل ایمان لا چکے تھے' اسلامی تحریکوں کی محنت کے فیض سے اب اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات مانتے ہیں۔ عوام کے سامنے جاتے ہیں تو اسلامی شریعت کے نفاذ کی اہمیت پر زور دیتے

ہیں۔ یہ ذہنی انقلاب معمولی بات نہیں ہے۔ مغربی تہذیب کے طوفانوں کے اندر مرعوب ذہنوں کو پُراعتماد بنانا اور "مستردِ اقدار" کو مقبول و محبوب بنانا فتحِ عظیم ہے۔ اس کا سہرا ان ہستیوں کے سر جاتا ہے جنھوں نے ان طوفانوں سے لڑ کر اور جان و مال کے نذرانے دے کر اسلام کی صداقتِ ابدیہ کو ثابت کیا ہے اور یہ وہ کام ہے جو قافلۂ تحریک کی فضا کی بدولت سرانجام پایا ہے۔

نظامِ معیشت پر اسلامی رنگ کی چمک

آپ مکتبوں اور نمائش گاہوں سے گزر کر دیکھیں۔ آپ کو ستّر فیصد وہ لٹریچر ملے گا جو اسلام کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتا ہے، اسلامی تاریخ کے مختلف گوشے کھنگالتا ہے اور اسلامی قوانین اور اسلامی معیشت و معاشرت کی وضاحت کرتا ہے۔ زندگی کا سب سے اہم پہلو معیشت ہے۔ نصف صدی پیشتر کوئی شخص یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ سود کے بغیر بھی بنکنگ ہو سکتی ہے۔ خود علمائے اسلام اس باب میں بے حوصلہ ہو چکے تھے، بلکہ بعض علما تو سود کو قبول کر لینے کی رائے دینے لگتے تھے۔ سب سے پہلی کتاب جس نے دورِ حاضر کے ماہرینِ اقتصادیات کو چیلنج کیا اور نظریۂ سود کے مضرات ثابت کیے اور اسلامی نظامِ معیشت کو علمی و عقلی حیثیت سے دنیا کے سامنے مفید و ضروری ثابت کیا، وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تالیف "سُود" ہے۔ کئی سال تک مسلمان اہلِ علم و ماہرینِ اقتصادیات اس کتاب کو حیرت کی نظر سے دیکھتے رہے۔ اور پھر اس کتاب نے جو دروازہ وَا کیا اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے عبقری ذہن اور نابغہ طبیعتیں حرکت میں آگئیں اور اس موضوع پر لٹریچر تیار ہو گیا کہ اب اس کا شمار کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ وہ قلم جو آدم سمتھ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے اب مودودیؒ کی "سُود" کے حوالے پیش کرتے ہیں۔ جو مادہ پرستانہ اور بے اخلاق معیشت کی ثناخوانی میں مگن تھے اب خدا اور رسولؐ کے پیش کردہ نظامِ اقتصاد کے فضائل و محاسن بیان کر رہے ہیں۔ یہی حال معاشرت، تعلیم اور دیگر شعبۂ حیات کا ہے۔

معیشت کے باب میں فکر و تصور سے بڑھ کر عملی اقدامات تک بات پہنچ چکی ہے۔ اسلامی اصولوں کے مطابق اسلامی بنک قائم ہو چکے ہیں اور قائم ہو رہے ہیں۔ اب تک ایسے بنکوں کی تعداد ۴۰ سے اوپر ہے۔ متحدہ عرب امارات، قطر، بحرین، کویت، اردن، مصر، سوڈان، ترکی، ملائشیا، بنگلہ دیش، پاکستان، ایران نیز ڈنمارک، بلجیم، سوئٹزر لینڈ اور وسط ایشیا کی چند جمہوریاؤں میں اسلامی بنک قائم ہو چکے ہیں اور بعض ممالک میں ان کی کئی کئی شاخیں وجود میں آ گئی ہیں۔ ان

ممالک میں ہم نے پاکستان کا بھی ذکر کیا ہے، لیکن پاکستان کا فیصل اسلامی بنک ابھی "نابالغ" ہے۔ اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔ ان بنکوں کے اندر مضاربت، مشارکت، اور مرابحت کی بنیادوں پر کاروبار ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں ابھی پوری طرح سودی ذہنیت کا خاتمہ نہ ہو سکا ہو، لیکن سودی معیشت کے متعفن ماحول میں اسلامی بنیادوں کو استوار کرنا جہادِ اکبر سے کم نہیں ہے۔ بے سود معیشت کا رواج دراصل اس سودی نظام کو چیلنج ہے جسے آج یہودی ساہوکار چلا رہے ہیں اور جسے دنیا بھر کے سرمایہ داروں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیویارک کی وال سٹریٹ اسلامی بنکوں کے قیام سے سیخ پا ہے۔ یہ لوگ اپنے مخصوص مالی و سیاسی ہتھکنڈوں سے اسلامی بنکوں کو ناکام اور مسلمان سرمایہ کاروں کو بددل اور مایوس کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھیں مسلمانوں کے اندر ایسے "سردار آصف" اور "سیّد طنطاوی" مل جاتے ہیں جو سود کو جائز قرار دے کر ملتِ اسلامی کو اسلامی نظامِ معیشت سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ان مرغانِ بادنما کی مذموم خواہشوں کے علی الرغم اسلامی بنکنگ میں روز بروز ترقی ہو رہی ہے۔ یہ کام براہِ راست اسلامی تحریکیں نہیں کر رہی ہیں، بلکہ یہ کاروانِ تحریک کی صدائے جرس کی بازگشت ہے۔

اسلامی تحریکیں سیاسی میدان میں

فکری اور تہذیبی جنگ میں اسلامی تحریکوں کی پیش رفت کے ساتھ سیاسی میدان میں بھی اس کی معرکہ آرائی جاری ہے اور شاید یہی وہ میدان ہے جس میں اسلامی تحریکوں کا اتر آنا مغربی طاقتوں کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر رہا ہے۔ مغربی ماہرین مسلسل یہ تجزیے پیش کر رہے ہیں کہ اسلام ایک جاندار تہذیب کی حیثیت سے انسانیت کا مستقبل بن سکتا ہے اور خود مغربی تہذیب کا تیز رَو زوال اسلامی تہذیب کو متبادل بنائے جا رہا ہے۔ بعض مفکرین نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی جس تیزی سے ترقی پذیر ہے اور وہ جس طرح کے خطرناک اور انسانیت کے لیے تباہ کن آلات تیار کر رہی ہے، اگر اسے باضمیر اور بااخلاق انسان کی نگہداشت میں نہ دیا گیا تو کوئی بعید نہیں کہ کسی بھی نفسانی جذبے سے مغلوب ہو کر موجودہ مادہ پرست انسان اس دنیا کو خاکستر کر دینے کا اقدام کر ڈالے۔ اسلامی عقیدہ ہی یہ تاثیر رکھتا ہے کہ وہ انسان کو باضمیر اور بااخلاق بنا دے، کیونکہ اسلامی عقیدہ انسان کے اندر خدا کا خوف اور آخرت کا محاسبہ اس طرح جاگزیں کر دیتا ہے کہ انسان پھر کسی جرم کا ارتکاب کرتے وقت سو بار سوچتا ہے۔

اسلامی تہذیب کی علمبردار اسلامی تحریکیں سیاسی جدوجہد کے ذریعے اقتدار کی تبدیلی چاہتی

ہیں۔ مسلم عوام بھی ایسی تبدیلی چاہتے ہیں جس میں ان کو عدل و انصاف ملے اور استحصال و انحطاط سے نجات پائیں۔ اگر اسلامی تحریکیں زمامِ قیادت ہاتھ میں لے لیتی ہیں تو اسلام کا زرّیں عہد واپس آ سکتا ہے اور دنیا علم و فن کے عروج کے ساتھ ساتھ اسلام کی برکات سے بڑی تیزی سے بہرہ مند ہو سکتی ہے۔ سقوطِ کمیونزم کے بعد اب انسانیت ایسے ہی عہد کی تلاش میں ہے۔ اس چیز کا تصور مغربی طاقتوں کے ذہنوں پر کابوس بن کر سوار ہو چکا ہے اور وہ جھنجھلاہٹ میں ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے تو رواں صدی کے آغاز میں کہا تھا:

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

اور اب اسلامی تحریکوں کی جدوجہد سے "چہرۂ افکار" سے پردہ اٹھ چکا ہے اور مغرب انھیں دیکھ کر بدحواسی میں مبتلا ہو چکا ہے۔

تحریکوں کی فکری و سیاسی پیش رفت گو ابھی قابلِ لحاظ نہیں ہے' لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ ایک وسیع اور ہمہ گیر تبدیلی عالمِ اسلام کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ انسانی نظریات ایک ایک کر کے شکست و ریخت کی نذر ہو رہے ہیں۔ مسلمان حکمران اور ان کے حواری اپنی افادیت کھو چکے ہیں' بلکہ عوام کی نفرت کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ان کی شان و شوکت کے اسباب داخلی نہیں خارجی ہیں۔ نہ فیصلے ان کے ہاتھ میں ہیں اور نہ وہ اپنی مرضی کے مالک رہے ہیں۔ گویا ایک آتش فشاں ہے' جو کسی وقت بھی دھماکہ خیز ہو سکتا ہے۔ ریاستی تشدد اور دباؤ کے ذریعے عوامی امنگوں کو بوتل کے اندر بند رکھنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔

الجزائر میں

اسلامی تحریکوں کا سیاسی قد گو پرکشش نہیں' مگر اطمینان بخش ضرور ہے۔ الجزائر کو لیجیے۔ وہاں دسمبر ۱۹۹۲ میں عین جمہوری طریقے سے اور الجزائری عوام کی بھرپور حمایت کے ساتھ اسلامک سالویشن فرنٹ پارلیمانی انتخاب کے پہلے مرحلے میں ستّر فیصد سے زاید نشستیں حاصل کر لیتا ہے اور اس بات کا پختہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ۲۰ روز کے بعد انتخاب کا دوسرا راؤنڈ بہت بڑے تناسب کے ساتھ جیتے گا۔ اسلامک سالویشن فرنٹ کا سربراہ ڈاکٹر عباس مدنی اور اس کے تمام ساتھی کئی ماہ سے جیل میں ہیں۔ مگر یہ نتیجہ سنتے ہی مغرب میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔ طرفہ یہ کہ عرب حکمران

مغرب سے بھی زیادہ سراسیمہ ہو جاتے ہیں اور ان کی پیٹھ بستر خواب پر آسودہ نہیں ہو پاتی۔ چنانچہ بیرونی طاقتوں (خاص طور پر امریکہ اور فرانس) کی شہ پر الجزائری فوج دو ہفتے کے اندر اندر اقتدار ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ انتخاب غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا جاتا ہے اور مراکش میں پناہ گزین ایک سابق سوشلسٹ لیڈر بوضیاف کو لا کر کرسی اقتدار پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اس فوری کارروائی پر "جمہوریت پسند" مغرب بھی خوش ہوتا ہے اور "اسلام پسند" حکمران بھی خوشی کے تار بھیجتے ہیں' اور کروڑوں ڈالر کی امداد بھی فوجی حکومت کو پیش کرتے ہیں۔ اس روز سے آج تک اسلامک سالویشن فرنٹ کے حامیوں (جن کی پشت پر پوری الجزائری قوم ہے) اور فوجی قیادت کے درمیان کشمکش برپا ہے۔ خانہ جنگی تک نوبت آ چکی ہے۔ فوجی حکمران روز بروز بے اثر ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ چکے ہیں' اور وہ کسی طرح اب اسلامک سالویشن فرنٹ کو مذاکرات اور مصالحت کی میز پر لانا چاہتے ہیں۔ مگر فرنٹ کی جگرور قیادت' جو جیلوں میں بند ہے یا جلاوطن ہے' ظلم و ستم اور تشدد و تعذیب کے باوجود کسی باطل کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہے' اور یہ واضح ہو چکا ہے کہ صنمِ باطل گر کے رہے گا۔

مصر میں

۱۹۵۴ سے لے کر جس تحریک پر ہر وہ ستم توڑا گیا ہو جس سے جنگل کے درندے بھی شرما جائیں' پھانسیاں' جیلیں' صحرا نوردی' تازیانے' ٹکٹکیاں' بے حرمتی اور بھوک اور پیاس کا عذاب اسے دیا گیا ہو' ۱۹۷۱ کے بعد وہ اس عذاب سے تو نکل آئی ہو مگر قانوناً کام کرنے کی اجازت نہ دی جائے' خوف و ہراس کا بھوت اس کے حامیوں پر مسلط رکھا جائے' اور پھر بھی وہ تحریک زندہ و تابندہ ہو۔ کیا یہ دورِ حاضر میں ایمانی طاقت کا حیرت انگیز کرشمہ نہیں ہے۔ مصر میں اخوان المسلمون کے ساتھ یہی کچھ ہوا اور یہی کچھ ہو رہا ہے' اور یہ "ایمانی طاقت" کا کرشمہ انھی بہادروں اور خدا پرستوں سے منسوب ہے۔ پارلیمانی انتخاب میں اخوان المسلمون اپنے نام سے حصہ لینے کے مجاز نہیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے دو دوسری پارٹیوں' حزب' الاحرار اور حزب العمل الاشتراکی کے ساتھ مل کر محاذ' بنایا اور محاذ کے ٹکٹ پر انتخاب میں ۱۹۸۹ میں حصہ لیا۔ اور ان کے امیدوار کامیاب ہو گئے۔ ان کامیاب ہونے والوں میں اخوان المسلمون کے بانی امام حسن البنا شہید کے صاحبزادے سیف الاسلام ایڈووکیٹ' اور اخوان المسلمون کے دوسرے مرشدِ عام (سربراہ) حسن الھضیبی کے صاحبزادے مامون الھضیبی ایڈووکیٹ بھی شامل تھے' اور یہ دونوں حضرات

قاھرہ کے انتخابی حلقوں سے کامیاب ہوئے۔ مصری پارلیمنٹ میں ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن آواز کے پیچھے کردار کی طاقت ایسی زبردست ہے کہ یہ نحیف و نزار آواز بھی دلوں میں کھُبتی جا رہی ہے۔ مصر کی بڑی بڑی پیشہ ورانہ تنظیموں پر بذریعہ انتخاب اخوان کو برتری حاصل ہے۔ انجینئر یونین' میڈیکل یونین' فارمسٹ یونین' لائرز یونین اوز دیگر مختلف یونینوں میں غالب اکثریت سے اخوان کو کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہ کامیابی نارمل فضا میں نہیں ہوئی' بلکہ ریاستی اداروں کی طرف سے اخوان کو پیچھے دھکیلنے کے تمام جائز و ناجائز حربے اختیار کیے گئے' بایں ہمہ اخوان عوام کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر اخوان المسلمون کو مصر میں دستوری اور قانونی راستوں سے کام کرنے کا موقع دیا جاتا تو یقیناً وہاں جو بھی تبدیلی ہوتی پرامن ہوتی۔ مگر افسوس ہے کہ مصری حکومت جو یہودیوں کو تو ہر طرح کے مواقع فراہم کرتی ہے' اسرائیلی وفود کا استقبال کرتی ہے' قبطیوں (مصر کے عیسائیوں) کو مکمل آزادی دیتی ہے' کیمپ ڈیوڈ کے بعد "مصرو اسرائیل" دوستی کے ادارے قائم کرتی ہے مگر اخوان کے بزرگ و دانش مند رہنماؤں کو عوام سے رابطہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک ماہانہ جاری کرنے کا ڈیکلریشن مسترد کر دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ مصر کی نوجوان نسل شدید ردِّعمل کا شکار ہو رہی ہے' اور وہ بقول سعدی' تنگ آمد بجنگ آمد کا منظر پیش کر رہی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ مصر میں بہت جلد "عوامی بغاوت" بھڑک اٹھے گی۔ امریکہ اگرچہ "بنیاد پرستی" کو ایک لمحہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے' اور مصر کی نوجوان نسل کے ایک گروہ کا رہنما عمر عبدالرحمٰن خود امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں بم کے دھماکے میں موردِ الزام بنا ہوا ہے' مگر عوامی طیش کے سامنے امریکہ کیا بند باندھ سکے گا۔

اردن میں

اخوان المسلمون کو اگر اپنے نام سے کہیں اجازت ہے تو وہ اردن ہے۔ ایک مدت تک تو وہ دعوتی' تربیتی اور رفاہی کام کرتے رہے' اور مصر و شام میں اخوان کے خون آشام حادثات کو دیکھ کر اپنے وجود کے تحفظ میں لگے رہے۔ رفاہی کاموں میں ان کا عمان میں ایک عظیم الشان اسپتال ہے جو پورے شرقِ اوسط میں غیر سرکاری اسپتالوں میں درجہ اوّل کا مکمل اسپتال سمجھا جاتا ہے۔ اور زرقا میں كلية المجتمع کے نام سے ایک کالج لڑکوں کے لیے اور اسی نام سے ایک کالج لڑکیوں کے لیے قائم ہے۔ لڑکیوں کے کالج میں اردن کے علاوہ خلیجی ممالک کی لڑکیاں بھی زیرِ

تعلیم ہیں اور ان کے لیے رہائش کا معقول انتظام ہے۔ کسانوں اور مزدوروں میں بھی ان کے خدمتی پروگرام منظم طریقے سے جاری و ساری ہیں۔ پچھلے ۶ برسوں سے وہ انتخابی سیاست میں حصہ لینے لگے ہیں۔ پچھلے پارلیمانی انتخاب (۱۹۸۷) میں ان کے ۲۴ افراد کامیاب ہوئے تھے۔ موجودہ انتخاب (نومبر ۱۹۹۳) میں ان کے ۱۶ آدمی کامیاب ہوئے ہیں۔ پہلے انھوں نے اخوان کے نام سے حصہ لیا تھا اور اب "اسلامک ایکشن محاذ" کے نام سے۔ کامیابی کے تناسب میں کمی کی وجہ انتخابی نظام کی تبدیلی' اور غیر منصفانہ حلقہ بندی ہے۔ نیز حکمرانوں کے سر پر اسرائیل اور امریکہ کی تلوار لٹک رہی ہے۔ اردن کی اسلامی تحریک اور فلسطین کی تحریکِ مزاحمت "حماس" دونوں ایک ہیں' اور اسرائیل اس اکائی سے لرزاں ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اردن کی تحریکِ اسلامی کی یہ کامیابی بہت اہم اور حوصلہ افزا ہے۔

ترکی میں

مصطفیٰ کمال پاشا نے اسلام کو سر زمینِ خلافت سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ قرآن کریم اور عربی زبان کی تعلیم بند' مسجدیں برباد' اذانیں خاموش' اسلامی لٹریچر ممنوع' عربی رسم الخط منسوخ اور علما قتل کر دیے گئے۔ فرنگی لباس لازم قرار دے دیا گیا۔ خلافت پر خطِ تنسیخ پھیر کر لا دینی نظام کو ملک و قوم کا نصب العین قرار دے دیا گیا۔ یہ سب کام محض قراردادوں اور قوانین کے ذریعے نہیں کیے گئے' بلکہ شمشیر و تفنگ کا سہارا لیا گیا۔ قسطمونی میں ملا سعید کردی کی تحریک کو جس طرح کچلا گیا اس میں مصطفیٰ کمال پاشا کی فرعونیت کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ ۱۹۲۸ سے لے کر ۱۹۵۶ تک یہ ہنگامہ رستاخیز برپا رہا۔ اس دور پُر محن میں ایک مجاہد عالم بدیع الزماں سعید نورسی مرحوم اور ایک نڈر شاعر عاکف بے نے (جسے ترکی کا اقبال کہا جاتا ہے) الحاد ولادینیت اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کی۔ قیدوبند کی صعوبتیں بھگتتے رہے' مگر شمعِ ایمان ہاتھ میں لیے طوفانوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ ۱۹۵۶ میں عدنان مندریس کی ڈیمو کریٹک پارٹی نے عصمت انونو کی ریپبلکن پارٹی کو انتخاب میں شکست دی۔ ڈیموکریٹک کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ عدنان مندریس نے انتخابی مہم میں ترک عوام سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ کامیاب ہونے کے بعد عربی میں اذان کو بحال اور اسلامی اقدار کا احیا کرے گا۔ اسی وعدے پر ترکوں نے اپنے باپ (اتا ترک) کی پارٹی کو زمین بوس کر دیا۔ عدنان مندریس نے بڑی حد تک وعدہ پورا کر دیا' مگر ترکوں کے لا دین حلقے' یہودی اور سیکولرزم میں مبتلا فوجی جرنیل اسے زیادہ برداشت نہ کر سکے۔ ۱۹۶۰ میں فوج نے

جمال گورسل کی قیادت میں انقلاب برپا کر دیا۔ عدنان کو دستور کی خلاف ورزی پر سزائے موت دے دی گئی۔ ۱۹۶۳میں دوبارہ انتخابات ہوئے اور سلیمان دیمرل کی جسٹس پارٹی کامیاب ہوئی۔ سلیمان دیمرل کی کامیابی بھی اسلامی عناصر کے تعاون کی مرہون منت تھی جنھوں نے انتخابات میں جسٹس پارٹی کا ساتھ دیا تھا۔ سلیمان دیمرل نے اسلامی عناصر سے بے وفائی کی۔ ۱۹۷۳ میں نجم الدین اربکان نے "ملّی نظام پارٹی" قائم کی' مگر چند ماہ بعد ہی حکومت نے اسے ممنوع قرار دے دیا کیونکہ اس نے اپنے اغراض و مقاصد میں اسلام کا ذکر کر دیا تھا۔ اس کے بجائے ملی سلامت پارٹی اسلامی عناصر کی نمایندہ بن کر اٹھی۔ اس نے انتخاب میں حصہ لیا اور ترکی کی دوسری بڑی سیاسی پارٹی کی حیثیت سے ابھر آئی۔ بلند اجوید کی سوشلسٹ ڈیموکریٹک پارٹی کے ساتھ وہ مخلوط حکومت میں شامل ہوئی۔ مگر پھر اسلام دشمن عناصر نے انگڑائی لی اور کنعان ایورین کا ۱۹۸۲ میں فوجی انقلاب آ گیا۔ ۱۹۸۴ میں جب سیاسی آزادیاں بحال ہوئیں اور ملکی انتخابات کا اعلان ہوا تو ملی سلامت نے بھی انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ انتخابی مہم کے دوران نجم الدین اربکان (صدر ملّی سلامت) نے قونیہ میں ایک عظیم جلسۂ عام میں تقریر کی۔ ترکی حکومت نے اس عوامی مقبولیت سے گھبرا کر اربکان پر ترکی دستور کی خلافت ورزی کا الزام لگایا۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا اور ترکی دستور کی "خلاف ورزی" پر ان کے خلاف مقدمات قائم کیے گئے جن سے وہ آخر کار سرخ رو ہو کر نکلے۔ ۱۹۸۳ میں رفاہ پارٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ ۱۹۸۷ کے انتخاب میں بھی اس نے حصہ لیا اور "متناسب نمایندگی" کے نظام کی وجہ سے اس کو ووٹوں کا وہ تناسب حاصل نہ ہو سکا جس کی بنا پر وہ کامیاب سمجھی جاتی۔ ۱۹۹۲ کے انتخاب میں اس نے سہ حزبی اتحاد میں شمولیت کی اور پورے اتحاد نے ۴۲ نشستیں جیت لیں۔ بعد میں ایک پارٹی (ترکش قوم پرست پارٹی) اتحاد سے اپنی ۱۴ نشستوں کے ساتھ علیحدہ ہو گئی۔ بلدیاتی انتخاب میں بھی رفاہ کو بڑی عظیم کامیابی ہوئی ہے۔ حالیہ انتخاب میں رفاہ پارٹی نے ترکی کے تمام بڑے شہروں میں کامیابی حاصل کر لی ہے' اور بلدیات کی ایک بڑی تعداد رفاہ کے پاس ہے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ آئندہ ملکی انتخاب میں رفاہ کو بڑی کامیابی ہو گی۔ ترکی کے بدلتے حالات مغرب کی نظر میں ہیں۔ ترکی کی اقتصادی رگ یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی خارجہ پالیسی پر امریکہ کی گرفت ہے۔ ذرائع ابلاغ اور داخلی امور' سیکولر اور مغرب زدہ طبقے کے تصرّف میں ہیں۔ ان تمام پھندوں سے گلو خلاصی کرانے کے لیے ترکی کی اسلامی تحریک کے پاس صرف ترک عوام کی طاقت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ امریکہ اور مغربی طاقتیں کس طرح "عوامی اسلامی سیلاب" کا مقابلہ کرتی ہیں۔

(جاری ہے)